بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اِشارات

پاکستان چونکہ ہندی مسلمانوں کی دینی بیداری کا مظہر ہے اس لیے اس کے معرضِ وجود میں آنے کے ساتھ ہی اس کے اربابِ بست و کشاد نے "تجدید و احیائے دین" کی طرف توجہ دینا شروع کی۔ گزشتہ تیرہ سالوں میں شاید ہی کوئی سربراہ ایسا ہوا ہے جس نے اس اہم موضوع پر اظہارِ خیال نہ کیا ہو۔ کارپردازانِ مملکت کا یہ طرزِ عمل اس ملک کے رہنے والوں کی ملی امنگوں کے عین مطابق ہے۔ اگر کوئی قوم جان و مال، عزت و آبرو کے زیاں سے ایک خطۂ ارضی محض اس لیے حاصل کرتی ہے کہ وہ اسے اسلام کی تجربہ گاہ بنائے تو اُسے اس مقصد کے حصول کے بعد بجا طور پر یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنے سربراہوں سے یہ دریافت کرے: حضور آپ کی یہ ساری تگ و تاز اپنی جگہ صحیح اور درست سہی لیکن براہِ کرم یہ تو فرمائیں کہ آپ نے اُس بنیادی مقصد کے لیے کیا کچھ کیا ہے جس کے لیے دراصل یہ ملک حاصل کیا گیا تھا۔ باقی رہیں یہ معاشی منصوبہ بندیاں اور سیاسی سرگرمیاں ان کے لیے تو متحدہ ہندوستان میں بھی کافی گنجائش موجود تھی۔

پاکستان کے ایک عام مسلمان کے اس فطری سوال سے اس مملکت کے عمائدین نہ تو کبھی غافل ہوتے ہیں اور نہ فی الواقع غافل ہو سکتے ہیں۔ اسی سوال کا جواب فراہم کرنے کے لیے اس ملک میں اسلامی ثقافت کے کئی ایک ادارے قائم ہوئے جنہوں نے اسلام کے مختلف پہلوؤں پر عصرِ حاضر کے تقاضوں کے تحت روشنی ڈالی۔ اسی غرض کے لیے یہاں سرکاری سرپرستی میں سیرت کمیٹیوں کی تشکیل کی گئی جنہوں نے بڑے تزک و احتشام سے جلسے کیے اور جلوس نکالے۔ پھر اسی

مقصد کی خاطر یہاں بین الاقوامی سطح پر مجالس مذاکرہ منعقد ہوئیں جن میں پاکستان اور بیرون پاکستان کے اہلِ علم نے شرکت کی اور بتایا کہ اسلام دورِ جدید میں کس طرح ایک رہنما قوت بن سکتی ہے۔

احیائے اسلام کے لیے سرکاری سرپرستی میں جو کچھ کیا جارہا ہے وہ اس عظیم مقصد کے حصول کے لیے بالکل ناکافی ہے جو اس قوم کے پیشِ نظر ہے۔ اس قسم کی نیم دلانہ کوششیں کبھی بھی کسی ملت کے اندر فکر و نظر کا کوئی ایسا زبردست انقلاب پیدا نہیں کرسکتیں جو اس کے افراد کو ایک خاص نصب العین کے پُرجوش مبلغین اور علمبردار بنا دیں۔ ان سے وقتی جوش و خروش تو پیدا کیا جاسکتا ہے لیکن اسلام کے لیے فضا ہموار نہیں ہوسکتی۔

پھر جب ہم احیائے دین کے لیے ان "ناکافی اور نیم دلانہ کوششوں کا بھی جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں فوراً یہ احساس ہوجاتا ہے کہ یہ کوششیں دین کے لیے جزوی طور پر بھی مفید اور کارآمد نہیں اور ان سے اُس حد تک بھی دین کو فائدہ حاصل نہیں ہوا جس حد تک پہنچانا مقصود تھا۔ انہوں نے دین کو قوتِ فکر و عمل بنانے کی بجائے اسے بازیچۂ اطفال بنا دیا ہے جس سے مسلمانوں کے اندر ایک زبردست ذہنی خلفشار رونما ہوا ہے۔ سرکاری مالیات اور قوتوں کا یہ افسوسناک زیاں گہری توجہ کا مستحق ہے اور یہ اندوہناک صورتِ حال ہم میں سے ہر فرد سے اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ ہم اس معاملے پر ٹھنڈے دل سے غور کریں اور سوچیں کہ آخر اس میدان میں حکومت اور اسلامی ثقافت کے ان بڑے بڑے اداروں کو کیوں کامیابی نصیب نہیں ہوئی

اس ناکامی کی سب سے بڑی وجہ ہمارے نزدیک تجدید احیائے دین کے کام سے ناواقفیت ہے جو لوگ اس عزم کے ساتھ کوشش کررہے ہیں اُن کا اولین فرض یہ ہے کہ وہ ایک طرف تو عالمِ اسلام میں پھیلی ہوئی مختلف ذہنی و اخلاقی بیماریوں اور کمزوریوں کو دُور کرنے کی سعی کریں اور دوسری

طرف اپنی ایمانی قوت اور دماغی صلاحیت سے دین میں ادنیٰ تحریف و ترمیم قبول کیے بغیر اسلامی اقدار کو اس دنیا میں نافذ کرنے کا منصوبہ بنائیں تاکہ شوخ اور پُرجوش مغرب کے چیلنج کا بڑی کامیابی کے ساتھ جواب دیا جا سکے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ کام جاہلیت اور اسلام کے مابین مختلف نوعیتوں کی مصالحتیں قائم کرنے سے تو سرانجام نہ پا سکتا ہے، بلکہ اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی صحیح صورت صرف ایک ہی ہے کہ اسلام کو جاہلیت کے تمام اجزاء سے پاک کیا جائے اور اپنی خالص صورت میں پھر سے اسے فروغ دینے کی کوشش کی جائے۔ اس نقطۂ نظر سے تجدیدِ دین جاہلیت کے مقابلے میں ایک سخت غیر مصالحت پسندانہ کام ہے اور کسی ادنیٰ سے ادنیٰ جزء میں بھی جاہلیت کی موجودگی کو گوارا نہیں کر سکتا۔

جس دین کو ہم دنیا میں زندہ کرنے کے متمنّی ہیں اگر اُس دین ہی میں تحریف و تاویل کا سلسلہ شروع کر دیا جائے تو پھر وہ ایک انقلاب انگیز قوت فکر و عمل کس طرح بن سکتا ہے۔ اُس کی حیثیت تو محض جاہلیت کے ایک وفادار خادم کی سی ہوگی جس کا فرض اپنی مالکہ کے ہر حکم کی تعمیل کرنا اور اس کے ہر فیصلے کی تائید کرنا ہے۔

مختلف مذاہب کی تاریخ پر ایک نگاہ دوڑائیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ تحریف و تاویل کا یہ سلسلہ کسی منزل پر رکنے نہیں پاتا۔ کسی دین کے علمبردار جب ایک مرتبہ اپنے اصل مقام سے لڑھکنا شروع کرتے ہیں تو پھر مسلسل پھسلتے ہی چلے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ ایک ایسے پست مقام پر گر جاتے ہیں جس میں انہیں اپنے دین کے اساسی تصورات تک کو بچانا مشکل ہوتا ہے اور اُن کے ذہن سے اپنے مذہب کی وہ امتیازی حیثیت ختم ہو جاتی ہے جس کی بنا پر انہوں نے اسے اپنایا تھا۔ ایک فوج کے لیے تو عین ممکن ہے کہ وہ چند قدم پسپا ہونے کے بعد پھر سے عزم صمیم کے ساتھ دشمن پر حملہ آور ہو اور میدان جیت لے لیکن دین کے علمبرداروں کے لیے یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ وہ جاہلی افکار و نظریات سے خود مغلوب ہو جانے کے بعد بھی اپنے اس دین کو ایک

زندہ قوت بنانے میں کامیاب ہو جائیں۔ دین کے اندر مصالحت جو دراصل ذہنی شکست اور عملی کمزوری کا ہی دوسرا نام ہے، ایک ملت کے لیے بربادی اور موت کا پیغام ہوتی ہے جس وقت ذہن اس طرف مائل ہو پس سمجھ لیجیے کہ اس قوم کے اندر اب داعی کی حیثیت سے زندہ رہنے کا جذبہ ختم ہو گیا ہے اور اُس نے از خود قیادت کا منصب چھوڑ کر مقتدی بننا پسند کر لیا ہے۔

اس مصالحت پسندانہ روش سے ہو سکتا ہے کہ ذہنی اعتبار سے ایک مغلوب و مفلوج قوم کو چند روز کے لیے یہ کہنے کا موقع میسّر آ جائے کہ ہم وقت کے تقاضوں کو خوب سمجھتے ہیں، ہم ترقی پسند ہیں ہم ہر سانچے میں بڑی آسانی کے ساتھ ڈھل سکتے ہیں اور ہم دنیا کی "ترقی یافتہ" قوموں کے ساتھ قدم ملا کر بڑھنے کی قوت و طاقت رکھتے ہیں لیکن یہ محض فریبِ نفس ہے اور حقائق اس کا پردہ بہت جلد چاک کر دیتے ہیں۔ تاریخ کے اوراق اس حقیقت پر گواہ ہیں کہ آج تک دنیا کی کسی قوم نے ذہنی غلامی کو قبول کر کے کبھی اس کرۂ ارضی میں اپنے لیے عزت و وقار کا مقام حاصل نہیں کیا۔ مصر، ایران، ٹرکی، انڈونیشیا میں سے آخر کونسا ایسا ملک ہے جس کے رہنے والوں نے مغربی افکار و نظریات کو بڑے ذوق و شوق سے قبول نہیں کیا اور مغربی تہذیب و تمدن پر پروانہ وار نہیں گرے، لیکن اس دنیا میں ان کی جو قدر و منزلت ہے وہ سب کے سامنے ہے۔ لاف و گزاف کے رسیا اپنے متعلق جو چاہے کہتے رہیں اور اپنے مصاحبین میں بیٹھ کر اپنے آپ کو برابر یہ باور کرانے کی کوشش کرتے رہیں کہ ہمارا اقبال عروج پر ہے، آج امریکہ کے ایک پرچہ میں ہمارا فوٹو شائع ہوا ہے یا انگلستان کے ایک اخبار نویس نے ہماری ترقی پسندی کی داد دی ہے، لیکن وہ لوگ جن کے ظرف چھوٹے نہیں ہوتے، جن کی نگاہیں دُور رس ہوتی ہیں اور جو خوابِ خیالی کی دنیا میں بسنے کی بجائے حقائق کا سامنا کرنے کی ہمت رکھتے ہیں، وہ ان ممالک کی قدر و قیمت سے پُوری طرح واقف ہیں اور اس امر کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ مجلسِ اقوام میں انہیں کونسا مقام حاصل ہے۔

باقی رہا وقتی تقاضوں کا خوف تو یہ محض ایک واہمہ ہے۔ خدائے لم یزل نے وقت کا ایک ہی قاضی مقرر کیا ہے اور وہ اسلام اور صرف اسلام ہے، جسے آدم علیہ السلام کے زمین پر اتارنے کے ساتھ ہی اس کرۂ ارضی پر نازل کیا گیا تھا۔ یہ قاضی ہر دور اور عہد میں ہر ملک اور طبقے میں، ہر قسم کے معاشی اور سیاسی حالات میں اپنا بے لاگ فیصلہ سناتا ہے اور نہ صرف فیصلہ سناتا ہے بلکہ ہمیں اس بات کی بھی دعوت دیتا ہے کہ اُس کے فیصلوں کی روشنی میں ہم انسانیت کی تشکیل کریں۔ اس منصف اور عادل کے فیصلوں کے خلاف نوعِ بشری آج تک جو کچھ کرتی رہی ہے اور قیامت تک جو کچھ کرے گی وہ سراسر غلط اور باطل ہے، اس لیے ہر دور میں وقت کا تقاضا صرف ایک ہی ہے کہ ہم اپنے سارے معاملات کو دینِ حق کے فرامین و احکام کے مطابق ڈھالیں۔ اسی جدوجہد کو ہماری اصطلاح میں "تجدید و احیائے دین" کہا جاتا ہے۔

اس منصب پر آج تک جو حضرات فائز ہوئے ہیں اور جن افراد نے بھی اس کام کا بیڑا اٹھایا ہے انہوں نے کفر کے ساتھ کبھی مصالحت اور سودے بازی نہیں کی بلکہ ہمیشہ اسے مٹانے کی سعی کی۔ کفر و الحاد کے وقتی اور پُرجوش نعروں کو صورِ اسرافیل سمجھ کر ان سے خوف زدہ اور مرعوب ہو جانا اُس ملت کو کسی طرح زیب نہیں دیتا جس کے کانوں میں ہر وقت لَا تَخَفْ کی صدا آ رہی ہو اور جسے واضح الفاظ میں اس امر کی بشارت دی گئی ہو: لَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۔

یہ محض ہمارے اس دور کی کرشمہ سازی ہے جس نے تجدید و احیائے دین اور کفر و الحاد کے ساتھ ہم آہنگی کے درمیان جو بیّن فرق ہے اُسے یکسر نظر انداز کر کے ان دونوں کو ایک ہی چیز سمجھ لیا ہے۔ دورِ جدید کے مجددین نے یہ فرض کر لیا ہے کہ اسلام کے احیا کے یہ معنی ہیں کہ کفر و الحاد اسلام کے جن قوانین کو زندہ رہنے کا حق دیتا ہے انہیں زندہ رکھا جائے اور جنہیں وہ برداشت نہیں کر سکتا انہیں خود اپنے ہاتھوں سے مٹا ڈالا جائے۔ تجدید سے ان لوگوں کی مراد یہ ہے کہ اسلام

میں ہر اُس اصول کو داخل کیا جائے جس کا عہد حاضر کی جاہلیت تقاضا کرے اور اسلام کے ہر اُس حصّے کو حذف کر دیا جائے جو کفر سے ٹکراتا ہو۔ آپ ان متجدّدین کے سارے تجدیدی کارناموں پر ایک نگاہ دوڑائیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان کی ساری تگ و دو صرف جاہلانہ افکار و نظریات کو سندِ جواز فراہم کرنے تک محدود ہے۔ ان لوگوں نے غلطی سے یہ سمجھ رکھا ہے کہ دورِ جدید میں اگر کوئی نظامِ حیات پنپ سکتا ہے تو وہ صرف وہی ہے جس میں مادیّت، نفس پرستی، تعیشات اور عقلیت کے لیے بھی اتنی ہی گنجائش موجود ہو جو مغربی تہذیب و تمدن میں موجود ہے اور ان مختلف میدانوں میں اگر ہم ذرا بھی پیچھے رہ گئے تو پھر اسلام کے زندہ رہنے اور بڑھنے کے سارے امکانات ختم ہو جائیں گے۔ چنانچہ دیکھیے کبھی یہ حضرات سُود کی حلّت کے لیے مختلف صورتیں نکالتے ہیں، کبھی بے حجابی کے لیے وجہ جواز فراہم کی جاتی ہے، کبھی موسیقی اور کبھی مصوری کو اجزائے دین ثابت کرنے کی سعی و جہد ہوتی ہے۔ یہ اور بیسیوں ایسے مسائل ہیں جنہیں یہ "ماہرینِ فن" مشرف بہ اسلام کر رہے ہیں۔

ان حضرات کی نیتیں خواہ کتنی ہی مخلصانہ اور پاک ہوں مگر اسلام کے معاملے میں ان کی اس مصالحت پسندانہ اور معذرت خواہانہ روش سے دین کبھی زندہ نہیں ہو سکتا۔ دین کو زندہ کرنے اور اُسے ایک طاقتور تحریکِ فکر و عمل بنانے کی واحد صورت یہ ہے کہ مسلمانوں کو مغربی الحاد و زندقہ کے اثرات سے بچایا جائے اور صدیوں کی ذہنی اور سیاسی غلامی نے اُن کے اندر جو برائیاں پیدا کی ہیں ان کو مٹانے کے پورے پورے انتظامات ہوں۔ پھر ریب و تشکیک نے اُن کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے اندر جس قسم کی ابن الوقتی اور بے اصولاپن پیدا کر دیا ہے اُسے اصول پرستی سے بدلنے کی کوشش کی جائے اور سب سے آخر میں ان کے اندر یہ جرأت ایمانی بیدار کی جائے کہ وہ ہر اُس جہالت کے مقابلے میں جو دنیا میں موجود ہے، مردانہ وار صف آرا ہوں، اور اس طرح اُس تہذیبِ جدید کے خلاف جس نے نئی قسم کی وحشت پیدا کی ہے، اور اُس ترقی کے خلاف جس میں جہنم کی آنچوں کا اثر ہے وہ نبرد آزما ہونا سیکھیں۔ یہ کام بڑا صبر آزما اور

بڑا مشکل ہے لیکن دین اسی صورت میں زندہ ہو سکتا ہے۔

یوں تو افکار و نظریات کی سودا بازیاں کسی دور میں بھی مفید نہیں ہوتیں لیکن یہ اُن حالات میں خصوصی طور پر بڑی خطرناک ہوتی ہیں جن میں ایک قوم ذہنی مرعوبیت میں گرفتار ہو کر اس قسم کے سودے کرنے پر آمادہ ہو جائے۔ اس کا سب سے بڑا نقصان ملت کو یہ پہنچتا ہے کہ اس کے افراد کی نظر میں حق و باطل کے پیمانے یکسر بدل جاتے ہیں۔ وہ غلطی سے یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ حق اُن کے پاس نہیں بلکہ غیروں کے پاس ہے اُن کے جن افکار و نظریات کی تائید دوسرے کریں وہ صحیح ہیں اور جو تصورات و اعتقادات دوسروں کی نگاہ میں صحیح نہ ہوں وہ لازمی طور پر غلط ہیں اور اس وجہ سے انہیں اپنا کر ہم کوئی ترقی نہیں کر سکتے۔

کچھ دیر تک تو اپنے افکار کو دوسروں کے تصورات کے مطابق ڈھالنے کی جدوجہد ہوتی ہے اور اسی کو "خدمتِ دین" خیال کر لیا جاتا ہے لیکن تجربہ شاہد ہے کہ نہ تو یہ گاڑی دیر تک چلتی ہے اور نہ ہی اس کام کو نئی پود عزت کی نگاہ سے دیکھنے پر آمادہ ہوتی ہے۔

افکار و نظریات کو کھینچ تان کر بالکل متضاد تصورات کے ساتھ ہم آہنگ کرنا کوئی ایسا آسان کام نہیں جو ہنسی خوشی سرانجام دیا جا سکتا ہے۔ ایک ایسا نظامِ حیات جو زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ہو اور جس کا ہر گوشہ اس کے بنیادی تصور کا عکس ہو وہ اپنے مزاج کے اعتبار سے ہمیشہ بے لچک ہوتا ہے۔ اُس کے کسی گوشے میں تبدیلی کے یہ معنی ہیں کہ اسے دوسرے حصوں سے بالکل کاٹ کر الگ کر دیا جائے اور اپنے اُس منبع سے بھی اُس کا تعلق منقطع ہو جائے جو اُسے زندگی بخشتا ہے۔ کسی زندہ نظامِ حیات کے جس عضو کے ساتھ یہ سلوک ہو گا وہ لوگوں کے اندر قوت و طاقت کا ذریعہ بننے کی بجائے اُن کے لیے وبالِ جان بنے گا اور جو قوم اسے اس مردہ صورت میں اپنے ساتھ چپکائے رکھنے پر مُصر ہو گی اس کا بھی وہی حشر ہو گا جو متعفن لاش کو سینے سے لگانے کا ہوتا ہے۔

ربانی ص۶۴ بہ

(بقیہ اشارات)

دوسرے کسی تصور کو موڑ توڑ کر پیش کرنے کی بھی کچھ حدود و قیود ہوتی ہیں۔ خصوصاً جہاں نظریات بالکل متصادم ہوں وہاں اُن کے مابین ہم آہنگی پیدا کرنا بہت ہی مشکل امر ہے۔ یہی معاملہ اسلام اور مغربی تہذیب کا ہے۔ ان دونوں کے درمیان اتنا بُعد ہے کہ کسی قسم کی حیلہ سازی اُس خلیج کو پاٹ نہیں سکتی جو ان دونوں کے درمیان حائل ہے۔ اس لیے جب بھی اسلام کے کسی شعبے میں اجتہاد کے نام سے تبدیلیوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے تو پہلے قدم پر ہی بے شمار رکاوٹیں پیش آنا شروع ہو جاتی ہے۔ اور ایک عام نوجوان یہ سوچتا ہے کہ جس منزلِ مقصود کی طرف ہم نے اتنی تگ و دو کے بعد جانا ہے، کیوں نہ اُسے شروع ہی سے قبول کر لیں۔ اس لیے وہ بالکل آغاز ہی میں اسلام کا جُوا اُتار کر مغرب کی غلامی کا طوق بڑی بے تکلفی سے اپنے گلے میں ڈال لیتا ہے۔

اعلان

رسالہ "ترجمان القرآن" کے ایجنٹ حضرات کی خدمت میں گذارش ہے کہ اگر اُن کے پاس رجب ۷۵ھ مطابق مارچ ۵۶ء اور جون ۶۰ء تا اگست ۶۰ء کے بچے ہوئے پرچے ہوں تو اُسی کمیشن پر جس پر انہوں نے ترجمان کے دفتر سے منگوائے تھے رجسٹرڈ ارسال کر دیں۔ پرچوں کی جو رقم بنے گی آنے والے پرچوں سے منہا کر دی جائے گی۔

چراغ الدین

منیجر ترجمان القرآن، اچھرہ

لاہور